(غلام گردش)

شہیدوں کے نام!

سپاہی گلفروش کے بدن سے خون کے آخری قطرے تیزی سے بہہ رہے تھے۔زندگی کی آخری سانسیں تھیں۔بندوق کو مضبوطی سے سینہ سے لگایا ہوا تھا۔لگ رہا تھا کہ بندوق گلفروش کے جسم کا حصہ ہے۔خاکی وردی لہولہو ہو چکی تھی۔یونٹ کے زندہ بچنے والے سپاہیوں نے گلفروش کو اٹھانے کی کوشش کی کہ کسی طرح وہ نزدیک ترین سی۔ایم۔ایچ پہنچ سکے۔مگر وقت تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔گلفروش نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو اُٹھانے سے منع کیا۔کلمہ پڑھا اور آخری فقرہ ادا کیا۔"جنرل صاحب کو کہنا کہ میری بندوق آخری وقت تک میرے ساتھ تھی۔اب یہ بندوق جنرل کے حوالے کر دینا" یہ فقرے ادا کر کے سپاہی گلفروش ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گیا۔چہرہ مکمل طور پر خاموش اور مطمئن۔فرنیئر کور کا ایک سپاہی تھا۔ایک عام سا انسان،مگر وہ ہرگز ہرگز عام نہیں تھا۔اسکی زندگی کے آخری فقرے میں بے انتہا طاقت تھی،عظم تھا۔ٹھیک چار ماہ پہلے ایک فوجی دربار میں شمولیت کی تھی۔تین ہزار سپاہی،ایک جگہ اکٹھے ہو کر اپنے سینئر افسروں سے انتہائی ترتیب سے سیکھنے کے عمل میں مصروف تھے۔آئی جی ایف سی نے تقریر میں ایک فقرہ ایسا کہا جسے گلفروش نے اپنے ذہن پر نقش کر لیا۔جنرل کے الفاظ تھے "اپنے ہتھیار کو گنوادینا بالکل ایسے ہی ہے،جیسے کوئی مرد اپنی بیوی کو گنوا ڈالے"۔گلفروش پٹھان تھا اور فقرے کے مطلب کو سمجھتا تھا۔شہید ہوتے وقت اسکے جملے،عزت اور تکریم کے محافظ تھے۔جب اسکی بندوق اس جنرل کے سامنے رکھی گئی اور گلفروش کے آخری فقرے دہرائے گئے تو ماحول سوگوار تھا مگر عزم کی روشنی ہر ایک کے چہرے پر موجود تھی۔عزم یہی کہ دہشت گردوں سے لڑیں گے اور انہیں نیست و نابود کر دینگے۔گلفروش سوات میں 2007 میں شہید ہوا۔یہ دہشت گردوں اور طالبان کے خلاف ہمارے ملک کی وہ جنگ تھی،جسے صرف اور صرف گلفروش جیسے بہادر سپاہیوں نے جیت کر دکھایا۔

کیپٹن عمیر عبداللہ کچھ دن پہلے شہید ہوا ہے۔کیا عمر ہوگی۔بیس یا بائیس برس۔یا شائد پچیس برس۔مگر عمر تو بے معنی چیز ہے۔یہاں اسی سے نوے سال کے ضعیف مرد اور خواتین بستر پر پڑے موت کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔مگر موت انہیں زندگی دیکر مزید تکلیف میں مبتلا رکھتی ہے۔عمیر ضرب عضب میں شوال کے علاقے میں جنگ لڑ رہا تھا۔میں نے صرف اسکی تصویر دیکھی ہے۔مگر تصویر تو انسان کی صرف شکل دکھا سکتی ہے۔اسکی روح اور جذبے کو تو بالکل عیاں نہیں کر سکتی۔شائد جذبہ،تصویر کا محتاج ہی نہیں ہے۔یہ تو زندگی کا محتاج بھی نہیں ہے۔شائد زندگی،اسکی چوکھٹ پر عزت اور تکریم کی بھیک مانگنے کھڑی رہتی ہے۔شوال انتہائی دشوار گزار اور مشکل علاقہ ہے۔دہشت گردوں کو یقین تھا کہ یہاں انہیں کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔مگر انہیں بالکل علم نہیں تھا کہ عمیر جیسے سرفروش مجاہد ابھی ملک میں موجود ہیں۔نوجوان نے اپنے ساتھیوں سمیت اس مشکل علاقے کو دہشت گردوں سے ہمیشہ کیلئے آزاد کروا ڈالا۔قیمت بہت زیادہ تھی۔مگر شائد عمیر کیلئے انتہائی معمولی۔اس جنگ میں لڑتے ہوئے شہید ہو گیا۔مگر شہید ہونے سے پہلے الفاظ جواہرات میں تولنے والے تھے۔کہنے لگا کہ اسکا عزم تھا کہ تمام علاقے کو دہشت گردوں کے شیاطین سے آزاد کروا کر رہیگا۔اس نے اپنی حد تک یہ کام کر لیا۔مزید کہنے لگا کہ ضرب عضب کامیاب ہو چکی ہے۔مجھے یہ فقرے بہت عجیب سے لگے۔ایک نوجوان،جو اپنی جان کی بازی ہار

کرمقصدِ حیات کو پورا کررہا ہے،اس میں کتنا شعلہ ہوگا کہ وہ آخری دم تک اپنے مشن کو یاد رکھے ہوئے ہے۔اس نے تو اپنا حق اسی وقت ادا کردیا،جب اسکے لہو کا پہلا قطرہ زمین پر گرااور زمین کو مقدس کردیا۔مگر عمیر کے والد،نے بھی اپنے الفاظ سے مجھے چونکادیا۔ عمیر شہید کا جسدِ خاکی،اسکے آبائی گاؤں تھرمٹھیاں لایا گیا،تو والد نے کہا،کہ وہ اپنے دوسرے بیٹے کو بھی محاذ جنگ پر بھیجنے کیلئے تیار ہے۔اسے فخر ہے کہ بیٹے نے بہادری سے لڑتے ہوئے جان،وطن پر قربان کردی۔میں لاہور کی سڑکوں پر جب نوجوانوں کو بڑے آرام اور اطمینان سے ہنستے کھیلتے دیکھتا ہوں،تو ایک سوال،عذاب کی طرح میرے ذہن سے نکل کر میرے سامنے کھڑا ہوجاتا ہے۔کیا ان نوجوانوں کو اندازہ ہے کہ انہیں خوش اور محفوظ رکھنے کے لئے،عمیر جیسے کتنے بہادر جوان اپنا فرض نبھارہے ہیں۔کیا واقعی،ان لوگوں کے چہرے پر ہنسی صرف اسلئے نہیں،کہ کہیں نہ کہیں،کوئی گلفروش اور عمیر رات گئے بندوق اُٹھائے دہشت گردوں کو نیست ونابود کرنے میں مصروف ہیں۔مجھے اپنے اس سوال کا جواب نہیں چاہیے۔مجھے تو صرف احساس کی وہ لہر چاہیے جو ان شہید بچوں کی قربانی کو یاد رکھے۔

کیپٹن آکاش ربانی،ضربِ عضب کا پہلا شہید تھا۔اسکے والد ایبٹ آباد میں ڈاکٹر ہیں۔انتہائی مختلف نوجوان۔اسے فوج میں کام کرنے کا جنون تھا۔پی ایم اے میں جانے کے بعد،بڑے اطمینان سے اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ایس ایس جی میں جانا چاہتا تھا۔کمانڈو بننا چاہتا تھا۔شائد یہی اسکی منزل تھی۔پر شائد یہ بھی اسکی اصل منزل نہیں تھی۔ضربِ عضب کے شروع میں کافی مشکل حالات تھے۔والد ڈاکٹر ربانی نے لختِ جگر کی زندگی کے آخری دو مہینوں میں اسے بالکل مختلف طرز کا انسان بنتے ہوئے دیکھا۔ایک بدلتا ہوا نوجوان۔اپنے اہل خانہ کو بار بار کہتا تھا کہ کمانڈو بننے کے بعد بہت خوش ہے۔کہتا تھا اسے اپنی فوجی زندگی سے عشق ہے۔میران شاہ،دہشت گردوں کا گڑھ تھا۔انکے مورچے،اسلحہ،سرنگیں اور محفوظ پناہ گاہیں،انتہائی مشاق طریقے سے بنائی گئی تھیں۔ہزاروں دہشت گرد،علاقے میں بڑے آرام سے زندگی گزاررہے تھے۔کسی قسم کے حکومتی نظم وضبط سے بے نیاز۔میران شاہ وہی علاقہ تھا،جہاں بازار میں بھی بنائی خودکش جیکٹیں بآسانی دستیاب تھیں۔ایک ہزار سے لیکر دس بارہ ہزار تک ہر قسم کا اسلحہ برائے فروخت موجود تھا۔پاکستان سے لائے گئے سینکڑوں مغوی تھے۔اغوا برائے تاوان کیلئے درجنوں لوگ زندگی اور موت کے درمیان معلق تھے۔شائد آپکو یاد نہ ہو،کہ میران شاہ وہ خوفناک علاقہ تھا جہاں قیدیوں کو عین چوک میں آہستہ آہستہ ذبح کیا جاتا تھا۔تڑپتی ہوئی لاشوں کی ویڈیو بنائی جاتی تھی۔لوگوں کے سروں کو تن سے علیحدہ کرکے،فٹ بال کھیلا جاتا تھا۔آکاش ربانی اور دیگر ساتھیوں کو پہلی ذمہ داری یہ سونپی گئی کہ وہ میران شاہ کو دہشت گردوں کے مکروہ تسلط سے آزاد کروائیں۔یہ کام آکاش جیسے سینکڑوں نوجوانوں نے ملکر کیا۔دہشت گردوں کے سب سے بڑے ٹریننگ کیمپ کو ختم کرنے کا اعزاز بھی اس مردِ آزاد کو جاتا ہے۔اس کیمپ میں خودکش بمبار افراد کی کھیپ درکھیپ تیاری کی جاتی تھی۔دہشت گردی کے خلاف عظیم کام،قوم کے انہی بچوں نے کرکے دکھایا۔شام چھ بجے،شمالی وزیرستان میں ایک آپریشن پر نکلا۔یہ اسکی دنیاوی زندگی کا آخری آپریشن تھا۔شام کے بڑھتے ہوئے اندھیروں کا فائدہ اُٹھا کر دہشت گردوں نے جیپ پر ہر طرف سے فائرنگ شروع کردی۔ شدید زخمی ہوگیا۔مگر آخری سانس تک ان بزدل لوگوں سے لڑتا رہا۔جنہوں نے للکارے بغیر اس پر وار کیا تھا۔دہشت گردوں کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ شدید زخمی حالت میں بھی فائر کررہا ہے۔وہ ڈر کر بھاگ نکلے۔مگر آکاش ربانی اپنی آخری سانسیں پوری کررہا تھا۔وہ

لڑتے ہوئے شہید ہوا۔ جب ساتھی فوجی، مدد کیلئے پہنچے تو اسے کسی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ اطمینان سے ابدی نیند سو چکا تھا۔ شہید ہونے سے چند دن پہلے ایک پرانے دوست نے پوچھا کہ اسکی ترقی کب ہوگی۔ جواب تھا، کہ شائد ایک ڈیڑھ سال میں، اگر زندگی رہی۔ لیکن ترقی سے بڑھ کر مجھے شہادت کی تمنا ہے۔ خدا نے اسکی خواہش پوری کر دی اور وہ عزم و ہمت کی داستان رقم کر کے دوسروں کو راستہ دکھاتے دکھاتے راہ فنا پر روانہ ہو گیا۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اگر فوج نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کی قربانی دی ہے تو اسکے شانہ بشانہ، پولیس کے جوانوں نے بھی بہادری کی داستانیں رقم کی ہیں۔ انکی قربانیوں کو اس طرح سراہا نہیں جاتا، جس طرح دفاعی اداروں کی تکریم کی جاتی ہے۔ کیا ہم ان پولیس والوں کو بھول سکتے ہیں، جنہوں نے چارسدہ میں واقع باچہ خان یونیورسٹی میں اپنی جرات سے دہشت گردوں کو اس وقت تک روکے رکھا، جب تک فوج کی کمک نہ پہنچ گئی۔ کیا یہ ایک معمولی بات ہے کہ اسلحہ اور تربیت کی کمی کے باوجود، پولیس والے ہر جگہ لڑتے ہیں۔ کیا کراچی میں، چند دن پہلے پولیو مہم کے رضا کاروں کو صرف اور صرف پولیس والوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ دیکر نہیں بچایا۔ کیا ہم سویلین بہادر لوگوں کی قربانیوں کو فراموش کر سکتے ہیں۔ جنہوں نے زندگی کی وہ سرحد پار کی، جو انتہائی بہادر شخص سرانجام دینے کی جرات رکھتا ہے۔ کیا ہنگو کے ہزاروں بچوں کو بچانے والا اعتزاز حسن، ایک معمولی بچہ تھا، جس نے خودکش بمبار کو اپنے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ بم پھٹا، وہ شہید ہو گیا۔ مگر سکول کے ہزاروں معصوم بچے بچ گئے۔

سارا دن لوگوں کو ملتا ہوں۔ زندگی سے معمور لوگ ۔ درجنوں سرکاری نشستوں میں شامل ہوتا ہوں۔ مجھے ہر طرف زندگی کی لہر محسوس ہوتی ہے۔ کسی ہوٹل میں کھانا کھانے جاتا ہوں، تو اطمینان سے بیٹھے ہوئے سینکڑوں لوگ نظر آتے ہیں۔ مگر میں اب ان تمام مقامات پر جا کر ایک عجیب سی اذیت کا شکار ہو جاتا ہوں۔ یہ تمام لوگ خوش و خرم اسلئے ہیں، زندگی کے مزے صرف اسلئے لوٹ رہے ہیں کہ دہشت گردوں کے سامنے، گلفروش، عمیر عبداللہ، آکاش ربانی اور اعتزاز حسن جیسے جرات کے پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ خود تو دنیا سے چلے گئے مگر ہمیں محفوظ سے محفوظ تر بنا گئے۔ کیا کبھی کسی نے بے جان قہقہہ لگاتے ہوئے تھوڑی دیر کیلئے بھی غور کیا ہے کہ سپاہی گلفروش شہید کے اہل خانہ پر کیا گزر رہی ہوگی۔ کیا کسی نے اپنی نئی گاڑی کو چلاتے ہوئے یہ جانا ہے کہ اگر کیپٹن عمیر عبداللہ اپنی زندگی قربان نہ کرتا، تو دہشت گرد اسکا کیا حال کرتے۔ کیا کسی وزیر اعلیٰ، وزیر نے کبھی غور کیا ہے کہ اگر کیپٹن آکاش ربانی، بے نام پولیس والے اور اعتزاز حسن جیسے بہادر وطن پرست نہ ہوتے تو انکا انجام کیا ہوتا۔ دہشت گرد انکے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بازار میں فروخت کر دیتے۔ یہ مقام فکر ہے اور یہی ماتم کا لمحہ بھی!

راؤ منظر حیات

Dated:24 April 2016